JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 40, Issue No.01

TITLE OF THE PAPER

ناولٹ دکھیارے میں تہذیبی وثقافتی عناصر کی عکاسی

AUTHOR(S)

* **Dr. Hafiza Shehla Iqbal**
Lecturer, Department Urdu
The Women University, Multan

** **Shabana Mansha**
Research Scholar, Department of Urdu
The Women University, Multan

CONTACT

* shehlla.iqbal@yahoo.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on: May 15, 2024
Accepted on: June 25, 2024
Published on: June 30, 2024

DETAIL(S)

Volume No. 40, Issue No. 01, Page No: 106-120
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2024. ©Journal of Research (Urdu) 2024.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 300 9561745

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
khawarnawazish@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu,
Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

* ڈاکٹر حافظہ شہلا اقبال ** شبانہ منشا

ناولٹ دکھیارے میں تہذیبی و ثقافتی عناصر کی عکاسی

Reflection of Cultural Elements in the Novelette "Dukhyary"

ABSTRACT

History of Lakhnow is full of cultural colours. Many writers depicted these hues in their writings beautifully with all its details. Anees Ashfaq is a well-known urdu writer. He presented the past and the future of culture through his novels. His novelette "Dukhyary" is a beautiful and meaningful description of comparison of the past and the future of Lakhnow. For this purpose, there are two stories in "Dukhyary", One story is of a mother and his three sons with different behaviours and the other one is of the future and the past of Lakhnow. Both stories are examples of marvelous creative tragedy and are linked in a symbolic way. Each part of this novelette, i.e plot, characters, detail of different buildings and norms, is enhancing the cultural change of Lakhnow in an artistic, nostalgic and romantic way. This article covers these aspects of this novelette with a critical and anlytical approach.

KEYWORDS

Novel, Novelette, Urdu Fiction, Cultural Aspects, History, Novelist, Lakhnow

ناولوں کے اندر ثقافتی عناصر کی عکاسی اس صنف کے ابتدائی دنوں سے ہے جس میں رتن ناتھ سرشار جیسے ناول نگاروں نے ایک مثالی نقطہ آغاز فراہم کیا۔اس روایت کو منشی پریم چند، کرشن چندر،راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالستار اور قرۃالعین حیدر جیسے نامور ناول نگاروں نے آگے بڑھایا۔ حالیہ دنوں میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اس وراثت کو "کئی چاند تھے سر آسمان"میں جاری رکھا، اور لکھنو کے ثقافتی اتار چڑھاؤ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ جیسا کہ سید محمد اشرف نے "آخری سواریاں"میں کیا ہے۔اسی طرح انیس اشفاق کا ناولٹ دکھیارے لکھنو کے ماضی اور حال سے جڑے تہذیبی و ثقافتی عناصر کا ایسا آئینہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہونے والی ثقافتی تبدیلیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ڈاکٹر صلاح الدین درویش ۲۰۲۲ء میں شائع میں ہونے والے مختلف ناولوں کے بارے میں اپنی

رائے بیان کرتے ہوئے ناولٹ "دکھیارے" کو فکری و فنی اعتبار سے پانچویں نمبر پر قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش لکھتے ہیں:

> "پانچویں نمبر پر آنے والا انیس اشفاق کا ناول "دکھیارے" ہے۔ جس میں لکھنو کے ثقافتی اور تمدنی باقیات سے جُڑے بڑے بیانیے کو ایک نیم پاگل شخص کی سر گذشت میں بیان کیا گیا ہے۔"(1)

لکھنوی تہذیب کی نمود ایرانی نوابین اودھ کے ہاتھوں ہوئی۔ گیارہ نوابوں نے مل کر اس خطے کو ترقی کی راہ پر ڈالا۔ لکھنؤ کو اگر ہندوستان کے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ "نواب واجد علی شاہ" کے دور میں اس تہذیب و تمدن نے نیا رخ موڑا۔ جس میں فن، آرٹ، رقص، شاعری اور موسیقی کی محفلوں نے رواج پایا۔ اس طرح ایک ایسی معاشرت وجود میں آئی، جو منفرد خصوصیات کی حامل تھی۔ اس معاشرت کو لکھنوی معاشرت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ریاست اودھ میں یہ معاشرت سو سال سے زیادہ کے عرصے میں ترقی کی طرف گامزن ہوئی۔ سلطنت اودھ پر جب انگریز اقتدار کی گرفت آہستہ آہستہ مضبوط ہونے لگی تو ریاست اودھ کے حکمران "شجاع الدولہ" نے انگریز فوج کی سنگینوں کے نیچے پناہ لی، اور رقص و سرور، اور راگ و رنگ میں خود کو غرق کر لیا۔ یہی وہ نقطہ آغاز ہے جب لکھنؤ میں ایک نئی معاشرت کا ابتدائی دور شروع ہوا۔ لکھنوی تہذیب کے بنیادی عناصر بناوٹ، تکلف اور تصنع تھے۔ پتنگ بازی، جانوروں کی لڑائی کے مقابلے اور کبوتر بازی وغیرہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کے مشاغل ہیں۔ لکھنوی معاشرت کے رہنے والے لوگ آپس کے میل جول میں بڑی گرم جوشی، محبت اور تکریم رکھتے تھے۔ اس تہذیب کے آغاز اور عروج و زوال کی مختصر کہانی کے بارے میں فدا علی عیش یوں لکھتے ہیں:

> "یہ شہر لکھنؤ نواب آصف الدولہ بہادر کا آباد کیا ہوا ہے۔ جس کی بے مثالی کا ہر شہر و دیار میں چرچا ہے۔ کم و بیش سو برس کا زمانہ گزرا ہے۔ کہ اتنی مدت میں آباد بھی ہوا۔ اجڑ بھی گیا، جب تک عہد شاہی رہا۔ وہ زمانہ اس کے اوجِ موج کا تھا۔ دور دور سے لوگ دیکھنے کو آتے تھے۔ صفحہ دل پر یہاں کی تصویر جنت نظیر کھینچ کر لے جاتے تھے۔ لکھنؤ ہر چیز کا خیر اد تھا۔ ہر علم و فن کا یہاں کامل استاد تھا۔"(2)

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

معاشی طور پر دیکھا جائے، تو بظاہر لکھنؤی معیشت ترقی کر رہی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر یہ معیشت پستی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ شہزادوں کی عیاشیوں، بے جا خرچ اور سلاطین کے شغل اور کھیل تماشے نے معیشت کو اُجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سیاسی طور پر ریاست کمپنی کی حکومت آنے کے بعد دن بدن گر رہی تھی۔ ریاست کے سامراج وسائل کو لوٹ رہے تھے۔ معاشی طور پر لکھنؤ کی زرخیزی اور بہتری کی معیشت بظاہر تسلی بخش تھی لیکن ملکی معیشت خستہ حالی کا شکار تھی۔ کمپنی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد حکومت نے ریاست کے وسائل کو لوٹ لیا اور یہ استحصال اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ شہزادوں اور سلاطین کے ساتھ عام لوگوں کو بھی اس بربادی کا احساس تھا لیکن وہ اس حقیقت کو ماننے سے نظریں چرا رہے تھے۔

اس تہذیب کے پروردہ راعی اور رعایا سبھی اس عیش پسندی کا شکار تھے۔ لیکن یہ عیش و عشرت خوشحالی اور فارغ البالی کا ماحول سراسر کھوکھلا اور کمزور تھا۔ ایسے ماحول کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی لکھنؤی معاشرت کے ساتھ بھی ہوا۔ اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد اس معاشرت کی چولیں ہلنے لگیں۔ اور تہذیب و تمدن کی یہ بظاہر خوشنما عمارت ملبے میں بدلنا شروع ہوئی۔ چنانچہ اسے کسی بیرونی طاقت کی بجائے خود اسی کے تمدن کے مظاہر نے زمین بوس کر دیا۔ اس عرصے میں جہاں ایک طرف عیش و عشرت کے ماحول نے معاشرے کھوکھلا کر دیا تھا وہیں دوسری طرف ادب آرٹ، موسیقی اور شاعری وغیرہ جیسے فنون لطیفہ کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ سرکاری سرپرستی میں فنون نے ترقی کی۔ اہل فن کی قدر افزائی کی وجہ سے ہندوستان بھر سے اہل فن لکھنؤ کا رخ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کے متعلق اہم ناول بھی لکھے گئے۔ جن میں "امراؤ جان ادا" (مرزا ہادی رسوا)، "طاؤس چمن کی مینا" از نیر مسعود اور ''کئی چاند تھے سرآساں'' نمایاں ہیں۔ انیس اشفاق نے بھی اپنے ناولوں میں اس تہذیب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ لکھنؤی تہذیب کا یہ زوال "دکھیارے" ناولٹ کا بنیادی موضوع ہے۔

انیس اشفاق کا ناولٹ "دکھیارے" 2014ء میں "گل زمین 157/4، ویل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ" سے شائع ہوا جو کہ 160 صفحات پر مشتمل ہے۔ ناولٹ "دکھیارے" میں لکھنو کی تباہ ہوتی تہذیب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لکھنو کی تہذیب گم ہو جانے کا منصف پر گہرا اثر ہوا۔ لکھنو جو کہ روشنیوں کا شہر تھا، جہاں ادب کی بازگشت اور گردونواح سے کانوں میں علم اُتر رہا تھا اور سینوں میں حل ہو رہا تھا۔ اس نے دہلی کے مقابلے میں خود کو اتنا سنوارہ کہ

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

پوری دلی اُٹھ کر یہاں آباد ہو گئی تھی۔ تہذیب، ثقافتی اقدار، آبادیوں، منڈیوں، بازاروں اور علم و دانش کے لحاظ سے غرض ہر طرح سے لکھنو ترقی کر رہا تھا۔ پوری دُنیا کی نظریں لکھنو کی طرف مرکوز تھیں۔ لیکن نوابین کے لکھنو سے رخصت ہوتے ہی لکھنو پر آسیب کا سایہ منڈلانے لگا۔ اہل لکھنو نے اپنی ہی تہذیبی اقدار کو مٹانا شروع کر دیا۔ اب لکھنو ایک اجڑا ہوا شہر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسی خراب حالی میں لکھنو کی تہذیب کے نشانات کہیں نہ کہیں مٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب بھی ان میں دلکشی موجود ہے۔ ان سب کا بیان "دکھیارے" میں انیس اشفاق نے کیا ہے۔

اس حوالے سے انتخاب حمید اپنی کتاب "اردو کے نئے ناول: صنفی و جمالیاتی منطق" میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "لکھنوی تہذیب کے طمطراق اور تزک واحتشام کا انہدام دکھیارے کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے۔ برصغیر میں اردو میں شاید ہی کسی دوسری تہذیب کے تنزل پر اتنی کثیر تعداد میں تاریخی، تخلیقی اور تجزیاتی مطالعات اور مخطبات شائع ہوئے ہوں گے جتنے لکھنو کی ثقافت، اس کے زوال اور ابتر صورت حال پر دستیاب ہیں۔ نامور تاریخ نویسوں، قد آور تخلیق کاروں اور اہل نقد و نظر نے اس ثقافت کو نگارشات کا مرکز و محور بنایا ہے۔ اس تناظر میں اور اس موضوع پر ناول لکھنا نہ صرف دانش و بصیرت بلکہ غیر معمولی عزم و حوصلے کا کام ہے۔"(3)

تاریخ، تہذیب، ثقافت، نوابین کی وضع داریاں، محفل، مجرے، مشاعرے، دیوان اور دستر خوان، کربلائیں، درگاہیں، امام باڑے، روضے اور باغات، سیر، تماشے، داستان گوئی، مخصوص لباس اور خوشبوجات کے لیے لکھنو کی شناخت تہذیب اور قدروں کی شکست و ریخت اب ہمارے لیے ناسٹلجیا کا کام کرتی ہے۔ اسی داستان کو انیس اشفاق اپنے ناولٹ "دکھیارے" میں رقم کرتے ہیں۔ اس ناسٹلجیک ٹرپ میں لکھنو اور اس کی مٹتی ہوئی تہذیب کی داستان عام فہم مگر لکھنوی صبہاو میں رچی بسی، حسن آباد کی معصوم اور دل آویز زبان میں سما گئی۔ "دکھیارے" ناولٹ وحدت تاثر اور بیانیے کا بہترین مرقعہ ہے جو 2014ء میں منظر عام پر آیا اور شائع ہوتے ہی اتنا مقبول ہوا کہ انتظار حسین اس بارے میں انگریزی اخبار "ڈان" میں لکھتے ہیں:

> "Ashfaq has not cared to take pains to depict it.He goes on writing with ease and facility. The

characters portrayed by him talk and behave in their own natural style ....Briefly speaking "DUKHYARE" though written in a very simple way , carries much meaning on the cultural as well as humanitarian levels."(4)

ان کے علاوہ اسلم فرخی، جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور الطاف فاطمہ وغیرہ نے بھی اس مختصر سے ناولٹ کو سراہتے ہوئے اس پر اظہار رائے کیا۔ اس ناولٹ میں دو کہانیاں ہیں ایک کہانی انسانوں کی ہے۔ اور ایک کہانی لکھنؤ کی قدیم عمارتوں اور حویلیوں کی ہے۔ اور یہ دونوں کہانیاں پر معنی انداز میں شانہ بشانہ چلتی ہیں۔ ایک طرف ایک ماں اور اس کے تین بیٹوں کی کہانی ہے۔ ماں کی وفات کے بعد یہ گھرانہ بکھر چکا ہے۔ اس کہانی کا محور تین بھائی ہیں۔ جن میں سے بڑے بھائی کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ "دُکھیارے" کے آغاز میں راوی کی ماں مر جاتی ہے۔ باپ بچپن میں ہی بچوں اور ماں کو چھوڑ جاتا ہے۔ راوی کی ماں نے محنت مزدوری کر کے اپنے تینوں بچوں کو پالا۔ منجھلے بھیا کسی بھی مشکل میں ماں اور چھوٹے بھائی (راوی) کے ساتھ کھڑے نہیں ہوتے۔ بڑا بھائی لازوال کردار ہے۔ جو ذہنی عارضے کا شکار ہے۔ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتا وہ مختلف بارگاہوں کبھی مسجد تو کبھی مندر میں ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ ان کے ذہن میں خلل ضرور ہے مگر ان کا انداز گفتگو ایسا ہے۔ کہ لوگ اسے یاد کرتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ اللہ نے انھیں کچھ خاص عنایت کیا ہے۔ اس ناول کے ان چاروں کرداروں (ماں اور تین بیٹوں) کا جائزہ لیا جائے تو سادہ لفظوں میں تو یہ لکھنو کے عام گھرانے کے بکھراؤ کی درد بھری داستان ہے، مگر بین السطور یہ کردار لکھنو کے تہذیبی اور ثقافتی اتار چڑھاؤ کی علامت ہیں۔

اس میں سب سے پہلا اور مرکزی کردار ماں کا ہے جس سے باقی تین کردار جڑے ہوئے ہیں۔ عالیہ بیگم (عرف علن) جو کہ ایک نواب زادی تھی۔ ماں کا کردار ایک ایسی عورت کے روپ میں سامنے آتا ہے، جس نے سخت تگ و دو کے ساتھ اپنے بچوں کو پالا، اور اس کے ساتھ ہی وہ لکھنو کی تہذیب اور رسوم و رواج کا پالن کرنے والی خاتون تھیں۔ جو سوز خواں بھی تھیں۔ والدہ حکیم کے خاندان کا حصہ تھیں اس لیے انھیں کئی طبّی نسخوں کا گہرا علم تھا۔ وہ

اپنے تینوں بیٹوں سے پیار کرتی تھی، لیکن چونکہ بڑا بیٹا ذہنی عارضے کا شکار تھا، جس باعث وہ غصہ کرتا اور انتہائی جذباتی پن کا اظہار کرتا، یوں نہ چاہتے ہوئے وہ ماں کے لئے تکلیفوں کا باعث بنتا رہا۔ آخر کار ماں بیمار ہو گئی۔ اب کہانی کے اس موڑ پہ ماں کی بیماری کی صورت میں تینوں بیٹے کے الگ الگ رویے سامنے آتے ہیں بڑا بیٹا ماں کی بیماری کے بعد ہر طرح سے ماں کے لئے مددگار ثابت ہونا چاہتا تھا، معاش کی خاطر وہ گھر سے باہر وقت گزارتا، لیکن ماں کے علاج کے لئے اور گھر کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے کوشاں رہتا، ماں مرنے سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی کی ذمہ داری بھی اسی کے کندھوں پر ڈالتی ہے۔ منجھلا بیٹا ماں اور گھر کے حالات سے لاتعلق رہا، اسے ماں کی بیماری سے کوئی سروکار نہیں تھا اور اس دوران وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جبکہ تیسرا بیٹا اس وقت بہت چھوٹا تھا، جو ماں کا درد سمجھتے ہوئے کچھ کر نہیں پاتا اور ماں کو آخری لمحات میں اپنے بڑے بیٹے کے لئے پریشان ہوتے اور لمحہ لمحہ مرتے ہوئے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا:

''کیا سوچ رہی ہو۔؟''

کچھ نہیں۔ تمہارا بھائی۔۔۔''

''کسی کام کے نہیں۔'' میں نے اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے کہا۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر بولی: ''اپنے دماغ سے مجبور ہے''

پھر ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد کہا:

''اس کا خیال رکھنا''

''تم تو خیال رکھتی ہو اس کا۔'' میں نے کہا،

''نہیں۔ میرے بعد۔۔۔۔ میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔''(5)

ماں مناسب علاج نہ ہونے کے باعث آخر کار وفات پا گئی۔ ماں کی وفات کے بعد اس کہانی کا تیسرا موڑ اور تینوں بیٹوں کے تین روپ سامنے آتے ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا جو کہ ماں کی زندگی میں ہی سب سے جدا ہو گیا تھا، اپنی الگ زندگی گزارتا ہے اور معاشی لحاظ سے خوشحال ہے، وہ نئے حالات کے مطابق چلتا ہے اور اس کی شخصیت سے گھر بکھر جانے کا کوئی ملال نہیں جھلکتا، ماں کی زندگی میں تو ماں کے کسی طرح کام نہ آیا لیکن اس کی وفات کے بعد وہ ہر جمعرات ماں کے لئے ختم شریف کا اہتمام کرتا، جس میں تمام رشتہ دار شرکت کرتے اور یوں وہ ایک مطمئن کردار کے طور پہ سامنے آتا ہے۔ چھوٹا بیٹا راوی ہے، جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہوتے ہوئے دراصل اس کہانی اور اس کے کرداروں کے مختلف

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

رنگ سامنے لانے کا ایک ذریعہ ہے۔ماں کی وفات کے بعد اس کے بڑے بھائی نے اس کی پرورش کی اور ماں کے ساتھ کئے گئے وعدے کو نبھاتے ہوئے اسے پڑھا لکھا کر اپنے پاوں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا۔راوی اس پوری کہانی میں ایک مسلسل اذیت کے شکار کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔جو اپنے بڑے بھائی کی جنونی کیفیت سے پریشان ہے،وہ پھر سے اس گھر کو جوڑنا چاہتا ہے جو ماں کی وفات کے بعد بکھر گیا۔کبھی وہ فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے ماں اور اپنے پرانے گھر کی یادوں سے جڑ جاتا ہے،اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنو کی گزشتہ خوبصورت زندگی،رسوم ورواج اور رنگوں کو بھی پیش کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بکھرے گھر، منجھلے بھائی کی دیوانگی اور لکھنو کی زوال پذیر ثقافت کا نوحہ بھی پیش کرتا ہے۔تیسرا کردار بڑے بھائی کا کردار ہے۔جو اس کہانی کا سب سے جاندار کردار ہے،بڑا بھائی ذہنی عارضے کا شکار ہے،اور اب وہ گردوں کی بیماری کا بھی شکار ہو چکا ہے۔چھوٹا بھائی مسلسل اس کی دلجوئی کی تگ ودو میں مصروف رہتا ہے، کبھی فسادات کے دنوں میں اس کی تلاش میں بھٹکتا ہے، کبھی مالی لحاظ سے اس کی مدد کر کے اسے اچھی زندگی دینا اور اس کا علاج کروانا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام کوششیں بے کار جاتی ہیں۔منجھلے بھائی کے کردار میں سیمابیت ہے،اور ایک ایسا انسان ہے جو موجودہ حالات کو قبول نہیں کرنا چاہتا خواہ وہ ماں کی موت کی حقیقت ہو یا پھر لکھنو کی عالی شان ثقافتی زندگی کا زوال ہو۔اور وہ سب کچھ ویسا چاہتا ہے، کبھی اپنا بکا ہوا گھر واپس خرید کر ماں کو خوشی دینا چاہتا ہے جو کہ اس کے مطابق مری نہیں،ماں کی قبر پر بھی جاتا ہے لیکن وہاں اپنے تخیل میں زندہ ماں سے گفتگو بھی کرتا ہے اور کبھی مختلف حویلیوں اور عزہ گاہوں کی شاندار عمارتوں کی خوبصورتی اور پرانی رونقوں اور رنگوں کو واپس لانا چاہتا ہے۔منجھلے بھائی کے کردار کی اس اذیت کو مصنف نے بہت خوبصورتی سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔مثلاً چھوٹے بھائی کو لکھے گئے ایک خط میں اس کی اس ذہنی حالت کی عکاسی یوں ہوتی ہے:

> ”میں نے موسیٰ باغ میں ایک مکان دیکھا ہے،ہم اس پیسے سے مکان خریدیں گے اور سکون سے وہیں رہیں گے۔ماں کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے۔آج کل وہ کہاں ہے۔پتہ لگاؤ اور مجھے بتاؤ۔مجھے اس سے ملنا ہے۔بڑے امام باڑے کی طرف تمہارا جانا ہوا؟ جانا تو دیکھنا اس کی دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں۔ویسے مرمت کا کام میں نے شروع کرادیا ہے اور آصف الدولہ کو بتا بھی دیا ہے وہ بہت خوش ہوئے۔“(6)

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

ان کرداروں کا اس ناول کے موضوع کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ کردار دراصل علامتیں ہیں۔ ماں کا کردار لکھنو کی سرزمین اور تہذیب و ثقافت کی علامت ہے، جو اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں مشکلات کا شکار ہوئی اور آخرکار دم توڑ گئی۔ دوسری طرف بڑے بھائی کا کردار لکھنو کے ان باشندوں کی نمائندگی کرتا ہے، جو بدلتے حالات سے سمجھوتا نہیں کر پائے کیونکہ وہ ذہنی طور پہ اس حقیقت کو قبول ہی نہیں کر پائے اور اس کے بگاڑ کی وجہ بھی وہی تھے:

> ''بھائی نے چمنی اتنی زور سے ماری تھی کہ ماں اپنا توازن کھو بیٹھی اور زمین پر گر پڑی، زمین پر گرتے ہی اس کا خون بہنے لگا۔ اس حملے میں خود بھائی کا ہاتھ بھی زخمی ہو گیا اور ان کی انگلیوں سے بھی خون بہنے لگا۔۔۔ کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ ماں کے سرہانے کگروندے کے بہت سے پتے ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں اور انہیں صاف کر کے گولے بنا رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں جب کسی کو چوٹ لگتی اور زخم سے خون بہتا تو ماں انہیں پتوں کے گولے بنا کر زخم پر نچوڑ دیتی۔''(7)

لیکن اب چاہتے ہوئے سب پہلے جیسا بھی نہیں کر سکتے تھے، اگر ماں کا کردار دھرتی کی علامت کے طور پہ لیا جائے تو مندرجہ بالا پیراگراف کے ذریعے لکھنو کے زوال کی ایک بڑی وجہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بڑے بھائی کا کردار اسی اذیت سے دوچار ہے اور اس کیفیت کے باعث وہ ذہنی خلل کا شکار رہتا ہے۔ ماں کی قبر لکھنو کے ثقافتی زوال کی تباہی کی علامت ہے، جس کے پاس وہ جاتا بھی ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم بھی نہیں کرتا، جیسے وہ اپنے بھائی کو لکھے گئے خطوط میں ایک طرف لکھنو کی عمارتوں کی بربادی کا بھی ذکر کرتا ہے، لیکن پھر اسے اس سب کو بحال کرنے کے حوالے سے اپنی کوشش کا بھی تذکرہ کرتا ہے جبکہ نہ ہی اس کی مالی حالت اور نہ ہی ذہنی حالت ایسا کرنے کی استطاعت رکھتی ہیں۔ اور بڑے بھائی کی موت بھی ماں کی طرح ہوتی ہے، دونوں انتہائی تکلیف میں جان دیتے ہیں، ماں کی موت پو پھوٹنے کے وقت ہوئی اور بڑے بیٹے کی موت مغرب کے وقت ہوئی۔ گویا یہ ایک شاندار اور پر عظمت دور کا اختتام تھا اور ان دونوں کا شاہد چھوٹا بیٹا ایک کرب کا شکار ہے۔ لیکن اس کے مزاج میں اب ایک ایسا ٹھہراؤ ہے جو طوفان کے گزرنے کے بعد اس کی تباہیوں کو قبول کر لینے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بھائی کی موت پر عزیزوں کو بڑی مجلس کے لئے لکھ جانے والے رقعے کے آخر میں لکھتے ہیں:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

"پچاس برس کی عمر میں بالآخر اپنوں کے درمیان آخری سانس لی۔۔۔کی دوپہر کربلا ملکہ جہاں میں دفن ہوئے۔اسی کربلا میں ان کی ماں بھی آسودہ خاک ہیں۔"(8)

بڑے بھائی کا کردار اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو اس صورتحال سے جذباتی طور پہ زیادہ وابستہ نظر نہیں آتے اور باآسانی حالات کو قبول کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ گئے۔البتہ راوی کا کردار ہمیں معتدل کردار کے طور پہ دکھائی دیتا ہے، جو لکھنو کے اس ماضی پسند لیکن باشعور طبقے کی نمائندگی کرتا ہے، جس کا دل لکھنو کی بربادی کے دکھ سے لبریز ہے، وہ کچھ بھول نہیں پاتا لیکن موجودہ حالات کو بھی قبول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اس کا دل ماضی کی یادوں سے لبریز ہے۔اور اسی کیفیت کے تحت وہ جس گلی محلے، حویلی، عزہ گاہ یا محل سے گزرتا ہے تو اس کی گزشتہ اور موجودہ صورتحال، رہن سہن کے طور اطوار اور تعمیراتی بدلاو کو پیش کرتا ہے اور یوں ساتھ ساتھ پیش کی گئیں لکھنو کی دو تصویریں ایک بامعنی موازنہ کی عکاس بنتی ہیں:

"شاہی زمانے کی عمارتوں کی جگہ اب ہر طرف نئی طرز کے پکے مکان دکھائی دے رہے تھے۔اصل محل کا بس ایک آدھ حصہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔محل کے اندر والے حصے میں ایک بڑا شاہی تالاب تھا جس کے دوسری طرف کا علاقہ غیر آباد تھا۔اس تالاب میں محل کے اصل مکین شغل کے طور پر گھنٹوں بیٹھ کر مچھلی کا شکار کھیلا کرتے تھے اور کبھی کبھی یہاں پیراکی کے مظاہرے بھی ہوتے تھے لیکن اب تالاب کا پانی بہت گندا ہو چکا تھا اور اس کے چاروں طرف پختہ عمارتیں بن چکی تھیں۔"(9)

لیکن ایک موڑ پہ آکر راوی کی شخصیت میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے، ماضی سے لگاؤ اور ماں کی محبت میں وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح ماں کے ساتھ کو حقیقت میں محسوس کرنے لگتا ہے:

"پھر اس ہیولے نے ماں کی شکل اختیار کر لی۔پھر وہ میرے ساتھ چلنے لگا اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔"(10)

یہ چار کردار تو اس ناولٹ کے مرکزی کردار ہیں، جن کی زندگی لکھنو کے اس تہذیبی اور ثقافتی بدلاو کے مختلف مراحل کا علامتی اظہار بھی ہے۔ان کے علاوہ بھی اس ناولٹ میں ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو لکھنو کے ماضی اور حال کی

متضاد صورتحال کے عکاس ہیں۔اس حوالے سے آغا سودائی کا کردار اہم ہے جو لکھنو کے زوال پزیر نوابین کی زندگیوں کی نمائندگی کرتا ہے:

> ''لکھنو کی سڑکوں پر میں نے بہت سے خستہ حالوں کو دیوانوں کی طرح گھومتے دیکھا تھا اور سب کے بارے میں یہی سنا تھا کہ یہ پرانے رئیس ہیں لیکن آغا ان سب سے الگ تھے۔ بوریہ نشینی میں بھی ان کی رئیسانہ شان دور سے نظر آتی تھی اور ان کے انکسار میں چھپی ہوئی تمکنت کو وہی پہچان سکتا تھا جس نے پرانے رئیسوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھے تھے۔''(11)

لکھنؤ کی ثقافت کے جوہر کو ناول میں شمامہ اور اس کی ماں کے ذریعے خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔1947ء کے ہنگامہ خیز سال میں، تقسیم کی افراتفری کے دوران شمیمہ کے والد کو المناک طور پر قتل کر دیا گیا اور ان کے گھر پر قبضہ کر لیا گیا، انھیں غربت میں چھوڑ کر ایک خستہ حال مکان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ مصیبت کے وقت شمامہ کی برداشت لکھنؤ کے لوگوں کی طاقت اور لچک کی آئینہ دار ہے۔ کہانی کے ان کرداروں کے ذریعے ہم اس شہرِ لکھنؤ کی پائیدار روایات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ شمامہ راوی کے ہمسائے میں رہتی ہے۔ یہ وہی کردار ہے جس کے گھر میں مصنف کے بڑے بھائی اکثر پناہ لیتے تھے۔راوی نے جب پہلی بار شمامہ کو دیکھا تو:

> "اگرچہ میں نے اسے ایک ہی لمحے کے لیے دیکھا تھا لیکن ایسے موزوں اور متناسب نقوش میں نے اس سے پہلے کسی اور نسوانی چہرے پر نہیں دیکھے، اس کے چہرے کا رنگ سرخ تھا اور یہ رنگ اس کے رخساروں سے اُبلا پڑتا تھا۔ شمامہ کے چہرے کے خطوط اور اس کی ماں کے شائستہ لب و لہجے سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لکھنؤ کا کوئی شریف اور مہذب گھرانہ ہے۔"(12)

ناولٹ کے عناصر ترکیبی میں پلاٹ اور کردار کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ناول ہو یا داستان، قصہ ہو یا افسانہ ہر صنف کرداروں سے ترتیب پاتی ہے۔ ناول نگار جو کچھ سوچتا ہے اسے وہ کرداروں کے ذریعے سے بیان کرتا ہے۔ کسی کہانی کا اصل کردار ہی بیان کنندہ ہوتا ہے یعنی کہانی لکھنے والا اور کبھی بیان کرنے والا مرکزی کردار کا کوئی قریبی دوست بھائی یا بہن وغیرہ۔ انیس اشفاق کے ناولٹ "دُکھیارے" میں کہانی مختلف کرداروں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

ناولٹ کے کردار متحرک ہیں جو قارئین پر دیرپا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ہر کردار کو مصنف نے پیچیدہ انداز میں پیش کیا ہے، جس میں راوی کے بڑے بھائی اور منجھلے بھائی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ نصیر کی خالہ داستان میں ایک معمولی لیکن اہم کردار ادا کرتی ہیں جو محرم کے دنوں میں خاندان کی روایات واقدار کے بارے میں بتاتی ہیں۔ دیگر معاون کردار، جیسے شمامہ، فرزانہ، حکیم صاحب، آغا سودائی، اور مختلف زائرین، کہانی کو آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں، جس سے مجموعی بیانیہ میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر انتخاب حمید اپنی کتاب "اردو کے نئے ناول: صنفی وجمالیاتی منطق" میں "دکھیارے" کے کرداروں حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> "ہر ایک کردار اس قدر باریکی سے گھڑا گیا ہے ،اس کے لباس، وضع قطع، معاشی و نفسیاتی کوائف، کردار اور گفتار اس کی وضع داریوں پر ایسی توجہ دی گئی ہے کہ ہر کردار اپنے عہد کی تصویر نظر آتا ہے۔"(13)

ناولٹ "دکھیارے" میں کچھ فرضی کردار بھی سامنے آتے ہیں محدود وقت کے بعد یہ کردار منظر سے غائب ہو جاتے ہیں راوی اور بڑے بھیا کہانی کو آگے لے کر چلتے ہیں یہی دونوں کردار ناولٹ میں شروع سے آخر تک لکھنؤ کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نور حسن ہاشمی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "اب بھی ناول ہلکا اور عامیانہ سمجھا جاتا ہے جس میں قصہ زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ بر خلاف اس کے کہوہ ناول جس میں قصہ سے زیاد دلچسپ کردار ہوں زیادہ بلند مانا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہی بتایا جاتا ہے۔ کہ قصہ کے ساتھ دلچسپی لینا ایک قسم کی طفلانہ دلچسپی ہے۔ جس کا اثر جلد ختم ہوتا ہے لیکن کردار سے وہی شخص لطف حاصل کر سکتا ہے جو زیادہ ذی فہم ہو اور یہ لطف گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔"(14)

ناولٹ نگار نے مفروضہ کرداروں کا انتخاب اور ان کی جانب سے ادا کیے جانے والے مکالمے اور استعمال کئے جانے والے الفاظ اور اسلوب بیان کو جس چابکدستی سے ادا کیا ہے وہ ان کے پرواز تخیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ناولٹ میں منظر نگاری کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور لکھنؤ کے تاریخی مقامات کا جس کامیابی سے نقشہ کھینچا ہے اس میں وہ سو فیصد کامیاب نظر آتے ہیں۔ مذکورہ ناولٹ میں اسم بامسمیٰ کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ناول کے ہر کردار پر یہ نام "دکھیارے" پوری طرح صحیح ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس ناول کا ہر کردار اسی طرف اشارہ کرتا ہے تو

غلط نہ ہو گا۔ کیوں کہ یہ ناولٹ ایک ایسے وقت کی غماز ہے جس میں ہر کوئی دکھ و مصیبت میں مبتلا نظر آتا ہے، ہر کسی کو مفلسی کا سامنا ہے، اور ہر شخص اپنے غم میں اس قدر غرق ہے کہ دوسروں کی بے کسی کی طرف توجہ کی انھیں فرصت ہی نہیں، اور اگر ہو بھی گئی تو تبادلہ اظہار غم دوراں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے غم میں شریک نظر آتے ہیں۔ "دکھیارے" کا موضوع لکھنوی تہذیب کے زوال کا عہد ہے لکھنؤ کی تہذیب گم ہو جانے کا مصنف پر گہرا اثر ہے۔ ناولٹ میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ آج سے لگ بھگ پچاس برس پہلے کی تہذیب ہے۔ مصنف نے ناولٹ میں اس طرح اس کی منظر کشی کی ہے، کہ قاری خود کو اس ماحول میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ ماں کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کے لیے مصنف جب حویلی جاتا ہے۔ وہ قاری کے سامنے اس حویلی کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے۔

> "میں نیچے کھڑے کھڑے حویلی کے پورے صحن میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ صحن کے بیچ میں بنا ہوا فوارا سوکھا پڑا ہے۔۔۔ ان غلام گردشوں کے پیچھے بنے ہوئے کمروں میں شیشم کی لکڑی کے خوبصورت دروازے تھے جن کی آرائش کے لیے ان پر خوبصورتی سے نقاشی کی گئی تھی۔۔۔ اندر روزوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں برسوں سے نہیں کھولا گیا ہے۔"(15)

ناولٹ "دکھیارے" میں فروعات نگاری کے عنصر کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ مصنف نے فروعات نگاری کے ذریعے سے گمشدہ ماضی، نوابی عمارتوں، حویلیوں، کچھ یادگار لمحوں اور کھوئے ہوئے چہروں کو تلاش کیا ہے اس میں مصنف نے کہانی کی ضرورت کے تحت مناظر کی تشکیل کی ہے مصنف نے فروعات نگاری کے ذریعے سے قاری کو لکھنوی تہذیب و معاشرت سے واقف کروایا ہے۔ "دکھیارے" میں ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ راوی کی ماں کو اپنے تہذیبی سرمائے سے کس قدر لگاؤ ہوتا ہے یہ پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی راوی سے باتوں باتوں میں کہتا ہے:

> "جانتے ہو؟" انہوں نے کہا: "جب ہمارے گھر کی وہ دیوار گری تھی، جو گولر والے مکان کی طرف تھی تو ماں نے لکھواریاں جمع کر کے پوری دیوار خود اٹھائی تھی اور اس پر مٹی اور چونے کا خود پلاستر کیا تھا" پھر بتایا: "اور محرم میں وہ پورے گھر میں چونا خود

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

یو پتی تھی اور ہمارے ہاں تو بقر عید کی انیتس کو علم کھڑے ہو جاتے تھے اور ماں رات بھر امام باڑہ سجاتی تھی اور بہت پہلے سے علم پٹکے نکال کر رکھ لیتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر کسی پٹکے پر لچکا لگانا ہوتا تو دن بھر بیٹھ کر لچکا لگاتی اور پہلی محرم کو تعزیہ لا کر امام باڑے میں رکھ دیتی۔"(16)

''دکھیارے'' کے مصنف نے بیانات کے تناظر میں جن جزیات کو پیش کیا ہے اس میں وہ اس پورے منظر کو نظروں کے سامنے رکھ دیتا ہے جس تک قاری پہنچنا چاہتا ہے کربلاؤں، درگاہوں، امام بارگاہوں، اور حویلیوں کی جزیات نگاری کو جس طرح اس ناولٹ میں پیش کیا گیا ہے وہ پڑھنے والے کو پوری طرح تہذیبی ماحول سے واقف کرا دیتا ہے۔ عمارتوں کے ساتھ ساتھ مصنف نے لکھنو کے گھروں کی حالات و کیفیات کو تہذیب کے آئینے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے راوی نے اپنے ہی گھر کے نقشے کی تصویر کشی کر کے قاری کو لکھنو کی اس عہد کی معاشرت سے آگاہ کروایا ہے ناول سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"پھر میں نے اس ڈھابلیوں کو دیکھا جن میں ہمارے کرائے دار نے کبوتروں کو لا کر پالا تھا ان میں سے کچھ دانہ چگ رہے تھے۔۔۔ کوٹھری سے باہر نکل کر میں دالان میں بچھی ہوئی میں مسہری پر کچھ دیر لیٹا پھر صنچی میں رکھے ہوئے مرتبان سے کھجوریں نکال کر کھائیں اور اسی مرتبان کے برابر رکھی ہوئی اچاری سے جوزی حلوہ سوہن کی ایک دو لوازتیں نکال کر منہ میں ڈالیں۔"(17)

ناول میں مصنف نے جگہ جگہ لکھنوی تہذیب اور تمدن اور معاشرے کی چال چلن کو دکھایا ہے اہل لکھنو زیادہ مذہبی نہ ہونے کے باوجود محرم کے مہینے میں ایک خاص طرح کی وضع اپنے اوپر طاری کر لیتے تھے یہاں تک کہ اس مہینے کی تقدیس طوائف کے کوٹھے پر بھی نظر آتی تھی اور وہ بھی اس مہینے کو ایک خاص رائج الوقت وضع کے ساتھ گزارتی تھی۔ امام باڑے سجاتی، علم نکالتی، عزاداری و مجالس کا اہتمام کرتی اور "امام اصغر" کا جھولا نکالتی غرض محرم کے مہینے میں ایک عجب سماں بندھا ہوتا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان سب نے امام باڑے کے اطراف میں ایک کے بعد ایک اپنے گھر اس طرح بنا لیے تھے کہ امام باڑے کی چار دیواری نظر آتی تھی پھاٹک سے گزر کر میں امام باڑے کے

> اندر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بھی اچھے خاصے لوگ صحنچیوں میں آباد ہیں امام باڑے کی حالت اچھی نہیں تھی اس کے گنبدوں پر گھاس اگی ہوئی تھی اور دیواروں کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ جانے کی وجہ سے اینٹیں دکھائی دینے لگی تھی۔"(18)

"دکھیارے" میں موجود واقعات اور مشاہدات میں حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے وہ آج سے تقریباً پچاس برس قبل کی تہذیب پر محیط ہے انیس اشفاق کو اپنی تہذیب سے بے پناہ محبت ہے ہر معاشرے کی اپنی الگ تہذیب ہوتی ہے اسی طرح لکھنو میں مہمان نوازی کی تہذیب کو مصنف نے ناولٹ میں بیان کیا ہے کہ جب میں بھائی کی تلاش میں شیش محل کی طرف رہنے والے اپنے ایک عزیز کے گھر گیا تو وہاں پر اگرچہ وہ اکیلا ہی رہتا تھا مگر اس نے کچھ کھلائے پلائے بغیر مجھے وہاں سے واپس نہیں آنے دیا ناولٹ سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "اور جب انہوں نے صنچی میں رکھے ہوئے نعمت خانے میں سے بھرتی کی کچھ ڈلیاں نکال کر انھیں ایک طشتری میں رکھا، پھر دالان میں رکھی ہوئی صراحی سے ایک کٹورے میں پانی انڈیلا اور دونوں چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "کھاؤ"۔
> (19)

اس ناولٹ کا مرکزی موضوع چونکہ گزشتہ اور موجود اجڑا ہوا لکھنو ہے اس لئے ناولٹ میں جگہ جگہ اضطراب پریشانی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے بڑے بھائی کی بیماری، ٹھکانہ تبدیل کرتے رہنا، گھروں اور جائیدادوں پر قبضہ ہو جانا، عمارتوں کا گرایا جانا، نوابوں اور شہزادوں کا سڑکوں پر آکر بھیک مانگنا، گھر سے بے دخلی کی صورت میں امام باڑوں کی صحنچیوں میں اور جنگلوں اور درختوں میں باقی ماندہ زندگی گزارنے کی مجبوری، ماں کی بیماری اور پھر حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہوا کہ بیماری کا علاج کروانے کی سمجھ بوجھ تک نہ ہو، مسلسل اور دائمی بیماری اور اس کا علاج کروانے کی بجائے بے اعتنائی جیسے تمام عناصر ناولٹ کی کہانی پر افسردگی اور اضطرابی کی کیفیت طاری کیے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ دکھیارے لکھنو کے تہذیبی، معاشرتی زوال اور لکھنو کے ان لوگوں کا نوحہ ہے جو بٹوارے کے بعد اپنی جائیدادوں سے محروم ہو جانے کی وجہ سے غربت وافلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 1, June 2024

حوالہ جات

1۔ صلاح الدین درویش، اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دس بڑے ناول (مضمون)،
https://www.Independenturdu.com/node/253
16اپریل2023، 12:34AM
2۔ فدا علی شاہ، فسانہ دل فریب، (لکھنؤ: ناشر ندارد، 1912ء)، ص4
3۔ انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول: صنفی و جمالیاتی منطق، (لاہور: کتابی دنیا، 2023ء)، ص182
4. Intizar Hussain, The End of Culture (Column), In: DAWN (06/07/2014)
5۔ انیس اشفاق، دکھیارے، (لکھنؤ: گل زمین، 2014ء)، ص11
6۔ ایضاً، ص14
7۔ ایضاً، ص9
8۔ ایضاً، ص156
9۔ ایضاً، ص17
10۔ ایضاً، ص57
11۔ ایضاً، ص92
12۔ ایضاً، ص136-137
13۔ انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول: صنفی و جمالیاتی منطق، ص182
14۔ محمد احسن فاروقی، سید نورالحسن، ناول کیا ہے، (لکھنؤ: دانش محل، 1951ء)، ص34
15۔ انیس اشفاق، دکھیارے، ص117
16۔ ایضاً، ص29
17، 18۔ ایضاً، ص30-31
19۔ ایضاً، ص30

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/